گنج ہائے گرانمایہ

از

رشید احمد صدیقی

صدر

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بسا المجتبی علی گڑھ

سنہ ۱۳۶۱ھ مطابق سنہ ۱۹۴۲ء

مطبوعہ

ریاض ہند پریس علی گڑھ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(غالب)

فہرست

میرے مولٰنا

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری!

مولانا سلیمان **اشرف** صاحب اس جہان سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو میرے لئے اب کسی اور میں نہیں میرا اُن کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا کہ اس رشتہ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لئے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے۔ بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست۔

پریشان ہوتا تو ان کے ہاں جاتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا۔ خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا ــــــ اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جا تا۔ گھنٹوں بیٹھتا۔ کوئی معمولی جان پہنچان یا تعلقات کا آدمی پہلے سے موجود ہوتا تو اسے رخصت کر دیتے۔ کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا تو اسے اٹھنے نہ دیتے۔ جو کچھ ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز موجود نہ ہو۔ مجھے چائے کا شوق نہیں مرحوم اس کے بڑے شائق

تھے اور بڑے تکلف سے پیتے۔ اصرار سے ایک پیالی دیتے۔ کہتے پی لو۔ پھر گپ ہو گی۔ ایک پان کھاؤ۔ دوسرا مجھے بنا کر دو۔

میں کہتا آپ کے ہاں چائے میں نہ شکر نہ دودھ۔ فرد کیسی ہوگی؟ کہتے میرے لئے پیتے ہو یا اپنے لئے۔ میں نے دبی زبان سے کہا بیوی بچوں کا بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی کبھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ رہ لیا کرو۔ میں کہتا آپ رام پوری تمباکو کھاتے ہیں۔ یہ میرے بس کی نہیں ہے۔ کہتے چائے میں دودھ شکر اور پان میں خوشبودار تمباکو کھاتے ہو۔ نشہ کا احترام کرنا نہیں آیا۔ آواز دیتے جمّا! رشید کی پیالی میں شکر ڈالنا۔ پھر پکارتے "چھن" رشید کو تمباکو دو۔ بڑی فرید ارمعطر تمباکو ہوتی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو، بال بچے کیسے ہیں۔ کیا کرتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمول بات ہوتی تو میں خود ہی کہتا یا انہیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی انھوں نے مجھے گھر سے بلوا نہ بھیجا۔ کیسی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے کہ چلتے پھرتے ملاقات ہو جائے گی تو کہہ دیں گے۔ ایسا موقع ہوتا تو صرف چند منٹوں میں بات ختم کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے "اچھا جاؤ"۔

مجھے خوب یاد ہے ایک دن میں "دو منزلے" کے سامنے سے بڑی تیزی سے سائیکل سے گذر رہا تھا سامنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے، فوراً پکارا

زرا ٹھہرتا، میں رکا سائیکل کو چبوترہ سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا، فرمایا نہیں نیچے ہی کھڑے رہو، ایک بات کہنی تھی، وہ تمہارا یار اصغر (شاعر) ابکے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا کیا شعر کہا ہے۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص مترنم کسی قدر حزیں لیکن پُر وقار لہجہ میں پھر پڑھا کہنے لگے، رشید اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الہ آباد تک ساتھ رہا بڑا اکڑا ہوا آدمی ہے۔ اب کبھی آئیں تو ضرور لانا۔ اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سناؤں گا، اس وقت جاؤ، خوش رہو!

مرحوم کے ہاں جائیے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کے لئے مخصوص نہ ہوتا، باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی، ہر بات بے ضغطہ زبان کہتے "بے ضغطہ زبان" انھیں کا فقرہ ہے۔ کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقالت کی زبان پر نہیں آتے لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا برجستہ کہتے کہ اس لفظ کی ثقالت کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں حلاوت تھی، کبھی کبھی خاص بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ دیتے کہ یہ خاص ہمارے دیار کا لفظ ہے، ایسا جامع لفظ کہیں اور نہ ملے گا۔

کرسی ہو، مونڈھا ہو، صوفا ہو، تخت ہو بیٹھتے ایک ہی وضع سے تھے
پاؤں اُٹھا کر اور سمیٹ کر۔ اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے
اور باتیں کرتے نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چبوترے سے متصل
نیم دائرہ سائبان میں مونڈھے بچھے ہوتے، ایک طرف چارپائی بھی ہوتی
بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کے لئے کوئی اچھی کرسی یا صوفا
وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اُسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا۔ اور سارے
مجمع کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی سے
آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ مولنٰنا نو وارد سے مرعوب
ہیں یا اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے
مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن مولنٰنا ہر ایک سے
ایک اُتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولنٰنا کا پرانا نوکر جما اسی طرح نواب
صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا
وہی بے ضغطہ زبان گفتگو، وہی نشست، وہی فضا، جس کا جی چاہا اُٹھ کر
چلا گیا۔ اسی دوران میں معزز نو وارد بھی تشریف لے گئے، اور مولنٰنا مرحوم
اپنی جگہ پر جوں کے توں باغ وبہار یا کوہ وقار بنے بیٹھے رہے!

زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اکثر
محسوس یہی ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص

ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا
کہ اس میں تھوڑا بہت گنوار پن بھی ہے۔ کوئی بڑا عالم فاضل ہوا تو اس میں
نخوت تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی۔ اللہ والے
ملے تو انھیں دنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکر خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں
رسول کی شرافت و عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع
اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے
کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے
جسے پورا کرنے کے لئے کسی اور کو ڈھونڈھنا چاہئے۔

میرا اُن کا بیس ۲۰ بائیس ۲۲ سال سے ساتھ تھا، پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں
نووارد کس مپرس طالب علم تھا، جب ان کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا۔
دوسروں کے نزدیک نہ سہی اپنے نزدیک سہی میں نے بھی اس مدت میں
بہت کچھ دیکھا، سنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ
نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم
نے جو سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قایم رہا۔ انھوں نے اپنی
خداداد ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے
نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ اسے یوں سمجھ لیجئے
کہ مولانا کی صحبت سے جب کبھی اٹھتا تو معلوم ہوتا کہ میں نے کوئی نئی اور

اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھا۔ رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوئے۔ یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا خاص طور پر نرغہ میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گذر چکا ہے۔ اس زمانہ میں میں نے مولانا کو دیکھا کہ کیا مجال کہ روزمرّہ کے معمولات میں فرق آجاتا جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمدہ میں لوگ بیٹھے ہوتے چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام نشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا۔ ایک دن شب میں میں بھی حاضر ہوا۔ میں مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے تھے۔ میں نے کہا مولانا کیا ہونے والا ہے خدانخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے

رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ چھیڑو گے۔ ہو گا کیا وہی ہو گا جو ازل سے تقدیر میں ہو چکا ہے۔ مومن کی شان یہی ہے کہ اس پر ہراس طاری نہ ہو۔ تم ڈرو گے تو اُن لوگوں کا کیا حال ہو گا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ۔

مولنا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شہنشاہیت روما کا وہ عہد یاد آ گیا جب گالس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں آ کر سینٹ کا رخ کیا جہاں کا ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر ذبح کر دیا لیکن کسی سینیٹر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ و زاری کی۔

وہ دن گذر گئے جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے" اس وقت میں اُس زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا۔ اس وقت صرف مولنا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے تاریخی دو منزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوتے تو بھی مولنا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا!

۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے، نان کوآپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے "گائے کی قربانی" اور "موالات" پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اُس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی۔ کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم مطعون ہو رہے تھے۔ لیکن نہ چہرہ پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔ اُس زمانہ میں میں اسی دو منزلہ کے عقبی کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کے نشست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حد فاصل تھی۔ جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا تھا کہتے تھے رشید دیکھو، علماء کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھر گھروندا بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اُس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں، اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر انھیں باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا

مرکز بنے لیکن کیا کروں، خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے لکھے پڑھے لوگ کیا کہیں گے۔

بالآخر مولانا نے ان مباحث پر قلم اٹھایا، اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہتے۔ اکثر مجھے بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ میں کہتا مولانا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ میں محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کہتے یہ بات نہیں ہے تم پر اس ہڑبونگ کا اثر نہیں ہے اور سمجھتے ہو کہ یہ سینکڑوں علماء جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی یوں ہی ہانکتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم تم زندہ ہیں تو دیکھیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر!

سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھدیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کے زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے، اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مولانا نے کہا کہ ہم نے آپ نے مولانا کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو مرحوم نے ہنس کر فرمایا، لیکن میں اُن کلمات کو دُہرانا نہیں چاہتا۔ اس سے بدمزگی اور پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے!

شاید تیس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا، جونپور میں **سیرت رسول** کا جلسہ تھا۔ مرحوم کی تقریر ہو رہی تھی جلسہ کیا ایک جم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع ایک ہی متنفس تھا، اتنے میں دور سے ایک بوڑھا پستہ قد نحیف شخص جھکا ہوا انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا، جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا، مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا یہ مولٰنا ہدایت اللہ خاں صاحب **جبروت** جونپور مرحوم کے استاد اور جونپور میں اس وقت علم و فضل کے چشم و چراغ تھے۔

مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا ان کی شفقت میں بھی جبروت کار فرما تھا۔ میں نے مرحوم کو جھجھک کر یا گول گول باتیں کرتے کبھی نہ پایا۔ ایک بار میں مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا۔ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے آدمی نے مولٰنا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا مولٰنا براہ نوازش آج شب کا کھانا غریب خانہ پر تناول فرمائیے۔ مولانا نے بغیر کسی تامل کے بے لاگ کہا، نہیں جناب میرا آپ کا کھانے کا کھاتا نہیں ہے یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صاحب بڑے خفیف ہوئے لیکن مرحوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، ہم سب سخت متحیر ہوئے۔ آخر میں مرحوم نے فرمایا، جی ہاں میرا ان کا کوئی

کھاتا نہیں ہے۔ اس قسم کے کتنے اور واقعات ہیں، کئی سال کی بات ہے، مرحوم اجمیر شریف جا رہے تھے اتفاق وقت جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنے والے تھے اسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کا یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا۔ ان سے مولٰنا آزردہ تھے، انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لئے تشریف لائے تھے۔ دل میں خوش ہو کر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مولٰنا نے بغیر کسی پس و پیش کے فرمایا "جی" اس سعادت کے لئے دوسرے آئے ہوئے ہیں میں ہاتھ نہیں ملاتا۔" یہ کہکر اپنے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔

آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسہ میں شریک نہ ہوئے۔ کسی بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تاوقتیکہ اُس سے یارانہ نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے مرحوم کی ایسوں ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین و مذہب سے دور کا بھی سروکار نہیں اور ایسوں سے بھی تھی جو اپنے وقت کے بڑے جید عالم دین سمجھے جاتے تھے، ہر شخص محبت و احترام کے جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن و مسرور واپس جاتا، جس سے طبیعت نہ ملتی تھی کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے۔ مرحوم اس معاملہ میں بڑے کھرے تھے۔ کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیف قلوب نہ کی۔ لیکن جن سے خاص تعلقات تھے اُن پر جان چھڑکتے

تھے، اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اُس کی خوشی سے باغ باغ ہو جاتے۔

مولانا کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کئے گئے کہ انھیں یاد کرکے آج تک میرا دل کڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے مجھے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ مولانا پر اس کا کوئی اثر ہے، ایک دن معلوم نہیں کونسا موقع تھا، اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو مرحوم نے فرمایا اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے "چلو آگے بڑھو۔ یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے، صاحبزادہ ہو یہی دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہہ رہا ہے، لڑائی مجھے پسند ہے، لیکن بہادروں سے بیسواؤں سے نہیں!"

مرحوم کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن وضاحت نہیں کر سکتا، ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے مرحوم کے دن رات کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں فرداً فرداً کوئی خاص جاذبیت نہ تھی لیکن یہی لوگ جب مرحوم کے حلقہ میں بیٹھے ہوتے تو یہ مجموعہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا، اور ہر شخص فرداً فرداً نہایت دلپذیر، اور یہ بات کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مرحوم کے

کمروں کے اندر جو چیز جہاں رکھی ہوتی اس میں بھی ایک خاص کشش نظر آتی۔ کم و بیش بیس سال سے مرحوم کے کمروں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری نظروں میں ہیں جو چیز جہاں آج سے بیس سال پہلے دیکھی تھی وہ آج تک موجود تھی کرسیوں کی وہی ترتیب کتابوں کی الماری اسی جگہ پر تخت کی وہی جگہ وہی پوشش، کھونٹیوں کا وہی مقام، پاندان اسی کرسی پر، چھوٹے چھوٹے بکس اور ٹوکریاں، تخت کے بائیں آتشدان پر گھڑی، بوتل، چائے کا ڈبہ، دو چار پیالیاں، کھلی ہوئی رشلف پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کا انبار، تخت کے اوپر کھونٹیوں پر لٹکی ہوئی قیمتی کپڑوں کی شیروانیاں، اور خوش رنگ صافے ایسا معلوم ہوتا جیسے مرحوم کی شخصیت کے یہ سب عناصر ترکیبی ہیں۔ اب ادھر سے گزر ہوتا ہے تو دو منزلہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور دل بھر آتا ہے۔

میرا پہلا مکان دو منزلہ سے بہت قریب تھا، مرداںے کے بیرونی دروازہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی جھلملی میں دو منزلہ کا قوسی برآمدہ اور چبوترہ نظر آتا تھا، گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی تھی، کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے

چبوترہ پر لمبی کشادہ آستینوں کا سپید کرتہ پہنے سر پر گول مخمل کی ٹوپی اور پاؤں میں دلّی کی نازک پر زر جوتی پہنے سر نیچے کئے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرتے نظر آتے، دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی، سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہے ہوں گے، اگر چلا جاؤں تو وہ اس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بس اتنا ہی احساس میرے تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر آجاتا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولنا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر اُن کی شفقت، مرحمت اور لطافت وظرافت سے جی سیر کر دوں۔

مرحوم کو میرے بڑے لڑکے اقبال سے بڑا انس تھا، حالانکہ ان کا تمام عمر کسی بچے سے سابقہ نہیں ہوا تھا وہ صرف چند مہینوں کا تھا کہ اسے بلا بھیجتے۔ گود میں بٹھاتے اس کا نام کدو رکھا تھا، پیشاب کر دیتا تو کہتے ابے کدو تو نماز نہ پڑھنے دے گا، اچھا کوئی ہرج نہیں کر بیٹا، بڑا ہو گا تو کہے گا مولنا ابا پر پیشاب کر چکا ہے۔ جب وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ناچ بے کدو ناچ۔ اس کے بعد اپنے مخصوص دلنشیں لیکن پُر وقار لحن میں کہتے تو ُم تو ُم رے باجے تو ڑی تو ُم تو ُم رے باجے تو ڑی

ہاں ناچ بے کدو ناچ۔

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو لیکر بھیکم پور چلے گئے، بغیر ہم سب کو اطلاع کئے۔ دوسرے دن واپس آئے۔ بعد خوش معلوم ہوا کہ بچے نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ لیکن مرحوم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انھوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ یکایک بغیر کہے سنے کیوں اقبال کو بھیکم پور لے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک بار دو دن کے لئے بغیر کہے سنے اقبال کو ٹونڈلہ لیکر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانہ میں بچہ کو دیکھ کر کہنے لگے کدو تیرا باپ تجھے کپڑے نہیں پہناتا اچھا دیکھ تیرے لئے میں کپڑا بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پر تکلف اچکن بناتے ہوئے حسب معمول اسے نچارہے ہیں۔

حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں سے اقبال کے لئے ایک نہایت خوبصورت چغہ اور عقال لائے۔ اقبال رات میں روتا تو صبح کے وقت مولٰنا کا آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدو کیوں رویا۔ اسے بھیجدو۔ اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خود لیکر جاتا، مرحوم بہت خوش ہوتے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں، میوے، پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے۔ اور کہلا بھیجتے کہ یہ کدو کے لئے ہے۔ وفات سے سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے ابے کدو اب میں

بیمار ہوں اور بڈھا ہو گیا۔ اب تیری لائی چیز کیسے کھاؤں۔

اکثر کہا کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو میں اسے عربی فارسی پڑھاؤں گا۔ اب کدو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں ناچے گا اس لئے اب لئے دسرا ناچ نچاؤں گا اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا، میں پریشان رہنے لگا، مرحوم نے سنا تو فرمانے لگے۔ ارے کدو کا جگر خراب ہے گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں، ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ یہ کتابی باتیں بتاتے ہیں، مریض کو نہیں پہچانتے، پہاڑ لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ، فائدہ ہو گا۔ لیکن کدو سے کہدو ناچتا رہے۔ تُوم تُوم رے باجے تو ڑی!

میرے مضامین کے بڑے شائق تھے، خود پڑھتے اور اپنے مخلصوں اور بے تکلف دوستوں کو سناتے، میں ملتا تو مضمون کے بارہ میں اپنی رائے بھی سنا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انھوں نے مضمون سنایا اور کس کس نے کیا کہا۔ لیکن اکثر اس کے خلاف بھی ہوتا، ایک دن یونیورسٹی آفس سے اتر کر اسٹریچی ہال کی طرف آرہے تھے، میں سڑک سے گذر رہا تھا سلام کیا بولے، اجی یہ تم کیا مہمل لکھنے لگے ہو۔ اس دفعہ کا مضمون بڑا لغو تھا، ہاں بالکل بے سر و پا۔ اچھا جاؤ اپنا کام دیکھو، میں نے چاہا کہ کچھ کہوں کہنے لگے بس بس آج اتنا ہی وہ دیکھو تمہارا یار آرہا ہے۔ جاؤ!

مرحوم کی سیرت کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا وہ جو چیز رکھتے تھے اس میں

کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی بڑی دلکش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اس
کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی، ہمیشہ پاکیزہ قیمتی اور مردانہ وضع
کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے اونی کپڑوں کا بڑا شوق تھا
شیروانی یا روئی دار اچکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دلکش ہوتا۔ ایک دفعہ
افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی، فاختئی رنگ کا کپڑا جس پر ابھرے
ہوئے ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے۔ ایک دن میں پہنچا تو بولے خوب آئے۔
بچھن وہ عبا تو لانا، یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مال غنیمت
ہیں۔ عبا لائی گئی، بڑے شوق سے پہنا، بولے کیا رنگ ہے، میں بہت قریب
پہنچ کر دیکھنے لگا۔ اس پر ہاتھ پھیرا اور ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار
کرنے لگا۔ بولے خیریت تو ہے اس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے؟
میں نے عرض کیا کیا کہوں۔ اسی طرح کی ایک چیز اس دن جلسہ میں نواب
فرمل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا، اُن کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی آج
آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس تخت طاؤس کو
ذرا چھو چھا بھی لوں بڑے زور سے ہنسے، کہنے لگے باز نہ آؤ گے، اچھا ایک
اِن بناؤ اور یہ تو بتاؤ وہ تمہارا یار ذاکر کہاں ہے بڑا مرد آدمی ہے، ذرا
صحبت اچھی نہیں ہے، میں نے کہا جی ہاں ان دنوں صحبت اچھی نہیں ہے،
بولے یہ کیا، میں کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے تم کہتے ہو

صحت اچھی نہیں پھر آواز دی جاذرا ایک طشتری میں رشید کے لئے پنڈی تو لانا۔

مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے۔ سردیوں میں باہر سوتے تھے، ابتدا میں تو بالکل صحن میں لیکن ادھر چند سالوں سے برآمدہ میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر، بستر گداز، چادریں ستھری، تکیے متعدد۔ پنکھے کا کوئی دستور نہ تھا۔ گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ پسینہ آنا بہت اچھا ہے۔ شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے۔ دوسرے کے تولئے یا رومال سے ہاتھ نہیں پوچھتے تھے، ننگے سر شاذ ونادر دیکھے جاتے تھے، گفتگو بلند آوازے کرتے کانا پھوسی گوارا نہ تھی عمامہ کشمیری ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دلی کی پُرزرر۔ ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتہ پہنتے۔ جس کے نیچے ہمیشہ ململ کی بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔ کسی کو اچھا کپڑا پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے۔ سالن بڑی تیز مرچوں کا پسند تھا۔ ہمیشہ چٹائی پر گردو بیٹھ کر کھاتے نوکروں کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی نہیں سیدھی ہوتی جیسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر گلے کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش طبعی یا خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے،

مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے نہ کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی
کے اقتدار سے - مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اُن
سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے - بڑا ہوتا تو اُس سے کہیں اور بڑا ہو کر ملتے، علم
کا وقار ان کے دم سے تھا - معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا!
قدمیانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتلے، نقشہ نرم و نازک،
آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اُتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا، نظر تیز و پُر اعتماد،
انداز میں بانکپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم، شمشیر و رباب سبھی زیب دیں، آواز
میں کڑک اور لچک، دھمک بھی - خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ
دیں گے، نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے
میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے -
جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے، یخ بھری ہوائیں
ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن بن کر اترتی جاتی ہیں -
ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے، مرحوم امامت کے لئے آگے بڑھے،
تکبیر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولنا نے کہا اللہ اکبر! ایسا معلوم ہوا جیسے اس
صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی - اس کے بعد جو قرأت شروع کی
ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے خالد کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی لرزتی گرتی
چمکتی کاٹتی، سمٹتی تیرتی اُبھرتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے - کوئی لمبی سورۃ

تھی۔ جب تک ختم نہیں ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم وجان میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ اور شوق خود سپاری میں ہمیں نہیں در و دیوار بھی جھوم رہی ہیں۔ اُس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور ہاں اس پر ایمان بھی ہے کہ وقت آگیا تو شوق شہادت دنیا کے ہر نشیب و فراز اور زندگی کے ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا!!

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارہ میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہے یا صرف دنیوی اقتدار کا حامل ہے اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار!

المبین شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہوگئی۔ المبین کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولٰنا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ "مولانا دوسرے ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا۔ ایک ذی وجاہت

بزرگ جن کو یونیورسٹی کے نظم ونسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سن و سال اور قومی خدمات کے اعتبار سے بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی۔ مرحوم سے ذرا فاصلہ پر دسترخوان پر موجود تھے۔ وہیں سے آواز دی ہاں مولنا میری بھی وہی رائے ہے جو سر اقبال نے دی ہے دوسرے ایڈیشن میں ......" اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مرحوم نے للکارا "...... صاحب بس کیجئے، آپ کھانا کھائیے، آپ کو ان باتوں سے کیا نسبت، ان باتوں میں نہ پڑئیے۔ کھانا کھائیے ـــــ ملاحظہ فرمایا نہ۔ ہاں بس کھانا کھائے جائیے!"

ایک اور بزرگ جن کے بارہ میں کچھ نہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ دینیات کے نصاب سے دلچسپی لینے لگے، کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیجدیا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلۂ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔ مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انھوں نے اسی کو غنیمت سمجھا ایک دن حلقہ چائے نوشی میں آکر شریک ہوئے اور تھیالوجی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "آپ کو دینیات سے کیا واسطہ، آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں۔ وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر

میں آموں کا تذکرہ آگیا۔ اس میں نو وارد نے بڑی انہماک سے حصہ لینا شروع کیا۔ مرحوم نے فرمایا یہ ٹھیک ہے۔ اس پر گفتگو کیجیے۔ ملاحظہ فرماتے ہونہ یہ آپ کا حق ہے!

کچھ دنوں کی بات ہے کہ مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے جید عالم ٹھہرے ہوئے تھے آپس میں بے تکلفی تھی ورنہ ظاہر ہے خانقاہ میں کیسے نیند آسکتی تھی، چلّے کی سردی تھی، مرحوم حسب معمول برآمدہ میں سو رہے تھے اور مہمان کمرہ کے اندر، مہمان تہجد کی نماز پڑھنے اٹھے دروازہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا کون؟ جواب ملا کوئی نہیں میں ہوں۔ بولے خیر تو ہے کہا وضو کروں گا، بولے تو کیجیے نہ کسی کی نیند کیوں حرام کرتے ہیں۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا، تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا "جہنم میں" مہمان نے کہا مکرر ارشاد ہو پورے طور پر سُن نہ پایا، بولے گرم پانی جہنم میں ملے گا، انھوں نے جواب دیا۔ تو تھوڑا راہ بتاؤ، مرحوم نے قہقہہ لگایا، بولے نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا!

ایک دن کلاس پہنچے، خلاف معمول بہت کم لڑکے نظر آئے پوچھا کیا بات ہے، معلوم ہوا، باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے، بڑے معرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا مولانا چھٹی دے دیجیے تو ہم سب بھی دیکھ آئیں، بولے ہاں چھٹی ہے، مقصود حاضری تھی، لڑکے نے جواب دیا مولانا

حاضری لیجیے گا تو بہتوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضری اپنی مقصود تھی، تمہاری نہیں، جاؤ جاؤ تم بھی پہنچ دیکھ آؤ!

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں کلاس میں **لوائح جامی اور گلشن راز** پڑھایا کرتا تھا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے کبھی کبھی اپنی دقتیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بڑے خوش ہوتے کہتے بیٹھو، میں کہتا مولٰنا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات میں جہاں اٹکتا ہوں۔ فرمایا یہی تو مصیبت ہے تفصیل سے باتیں نہیں سنتے تھوڑا سا پالیا اور بھاگ نکلے، طالب علم یہ نہیں کرتے یہ کام اٹھائی گیروں کا ہے۔ پگڑیاں ہوں یا ڈگریاں سب اٹھائی گیرے، علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے، میں نے کہا مولٰنا گھنٹہ ہونے والا ہے آخر اٹھائی گیروں پر بھی تو برا وقت آتا ہے کہتے اچھا اچھا بولو پڑھو میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے۔ کہتے معلوم ہے پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور میں چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں قرآن پڑھ ڈالو لوائح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دو گے لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا۔ آگے تم جانو تمہارا کام اور رہا ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جائے گی۔ کہتے ٹھیرو ٹھیرو، پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے

دلے، انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ!

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے ایک صاحب بھی تھے جن کو خانقاہ سلیمانیہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن اکثر بار پا جاتے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دہکتا مہکتا نیم جرعہ لیتے ہوئے فرمایا بھائی میں تو مولانا لطف اللہ صاحب کی کرامت کا بھی قائل ہوں۔ نو وارد نے تعجب میں آکر پوچھا مولانا یہ کیونکر، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے"!

کئی سال ہوئے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زنانی سواریاں آئی ہوئی ہیں میں نے کہا چلو مولانا کے ہاں ہو آؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کلاسکل چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر پاؤں اٹھائے اکڑوں بیٹھے ہوئے کوئی چیز بڑے غور سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا مخل تو نہیں ہوا، بولے بیٹھ جاؤ، ابھی بتاتا ہوں، میں بیٹھ گیا، عینک کے اوپر سے نگاہ کر کے بولے ٹھکانے سے بیٹھو، گپ ہو گی تھوڑی ہی دیر میں پرچہ علیحدہ رکھ دیا، عینک

کو اس کے خانہ میں رکھا پھر بولے سنو۔

اِدھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

"بے نظیر شاہ" کو جانتے ہو نہ، میں نے کہا جی، شاہ صاحب کو کون نہیں جانتا، کہنے لگے اور سنو۔

ازل میں ہرا انجام لکھا گیا
شب غم کی لیکن سحر رہ گئی

بولے یہ شخص چھوٹی بحر میں کہنے کا بادشاہ ہے، میں نے کہا درست بادشاہوں کا کیا کہنا، بے اختیار ہو کر فرمایا، وہ بھی ٹھیک کہتے ہو، ہاں ہاں ہم سمجھے بادشاہوں کا کیا کہنا۔

میں نے کہا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا، فرمایا نہیں یہ نہیں، ایک اشتہار تھا، میں اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے تمہاری قوم کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دوا کا اشتہار تھا۔ دنیا میں اور امراض کی دواؤں کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی مرض ہے، جدھر دیکھو اسی کا چرچا، جس طرف دیکھو قوت مردمی کا ماتم، جہاں دیکھو مایوس العلاج، اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کرتوت ہیں، کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں اور پھر یہ بھی تو دیکھو تمہاری

اُردو کہاں جا رہی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی اشتہارات، یہی امراض
میں نے کہا جی ہاں، فرمایا 'اچھا اچھا' کھانا کھالیا ہے؟ میں نے کہا
جی نہیں، کہنے لگے یہ بھی اچھا ہوا۔ میں کھالوں تو گپ ہوگی، تمہیں نہیں
کھلاؤں گا۔ آج کل صرف ایک پھلکا اور کدو گوشت کا سیٹھا پھیکا
شوربا ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں نے کہا۔ جی ہاں وہ تو قائم سی
ہوگئی ہے، ہنسے آواز دی، جمّا نکتیوں کے لڈو لاؤ۔

لڈو آئے تو بولے کھاؤ منیر کے ہیں منیر کے۔ منیر کا نام سنا ہے۔
میں نے کہا جی ہاں۔ خط و کتابت بھی رہی ہے۔ بولے ہائیں یہ کیا؟ میں
نے کہا وہی "برادرم شمس الدین و زین الدین"۔ ہنسے فرمایا خوب یاد
رکھا اور ہاں ایک کدو کے لئے لیتے جانا۔ کدو اب بڑا ہوگیا۔ ہاکی کھیلی
ہے۔ خوب ناچتا تھا۔ کدو کہیں کا!

کھانے سے فارغ ہوئے حسب معمول صراحی سے براہ راست
حلق میں پانی انڈیل کر پیا ہاتھ دھوئے اور اپنے سرخ لمبے چوڑے
رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے باہر نکل کر چبوترے پر مونڈھے پر بیٹھ گئے،
تھوڑی دیر تک خلال کرتے رہے، میں نے پان بنا کر دیا اسے لے کر منہ
میں رکھا، مونڈھے سے ذرا ایک طرف مائل ہو کر پہلی پیک براہ راست
پیتل کے چمکدار اگالدان میں ڈالی جو ٹھیک سوراخ میں جا گری

اور اوگالدان کے حاشیہ پر چھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح اپنی اونچی کرسی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اوگالدان میں پیک ڈالتے تھے اور کہیں اِدھر اُدھر اوگالدان پر چھینٹ نہ پڑتی۔

غرض مہینہ کا شاید یہ تیسرا ہفتہ تھا' اکتوبر کا مہینہ' رات کسی قدر بھیگنے لگی تھی چاند افق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا لیکن اس کا مدھم نمناک اُجالا درختوں کی پتیوں اور عمارات کے کنگروں پر نمایاں ہو چکا تھا بولے کل رات میری طبیعت گھبرائی' کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بالآخر دل میں آیا کہ مُردوں سے گفتگو کروں' کہو کیا سمجھے' میں نے کہا بالکل نہیں سمجھا' کہا ہاں مُردوں سے۔ پھر اس کی وضاحت کی فرمایا۔ میں نے وہ پلندہ نکالا جس میں ۲۵ ۔ ۳۰ برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں' دوستوں میں سے جو وفات پا چکے ہیں اُن کے خطوط۔ وہ خطوط جو انھوں نے زندگی میں لکھے تھے ان سب کو نکالا بعض بالکل شکستہ تھے بعض کی سواد تحریر بے نور ہو چکی تھی۔ بعض اس طرح لفافوں میں رکھے ملے جیسے ان کو میں نے کھولا ہی نہیں تھا۔ مہریں تک پھیکی پڑ گئی ہیں۔ انھیں میں نے بڑی احتیاط سے کھولا۔ ڈر کر محبت سے کبھی بے اختیار ہو کر کبھی مسرور ہو کر کبھی جھجک کر کھولا۔ ان سے باتیں کیں۔ وہ زمانہ یاد آ گیا جب زندگی عبادت تھی ان کے خلوص سے ان کے جھگڑوں سے ان کی فرمائشات سے۔ کسی میں کسی کے آنے کا مژدہ

تھا۔ کسی نے بلایا تھا کسی نے مجھے پریشانی میں تسکین دی تھی۔ پھر میں بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ مر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سب زندہ ہیں، میں ہی مر چکا ہوں۔

پھر بولے، اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے، تم تو جانتے ہو بھائی صاحب مرحوم پورے پاگل تھے۔ میں نصف پاگل ہوں۔ کبھی کبھی پورا پاگل ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت ناواقف مجھ سے آزردہ ہو جاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوط ملے۔ پاگل کا ذہن تم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سریع السیر، ایسا شفاف اور ایسا رنگین ہو جاتا ہے کہ بس۔۔۔۔۔ اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہے۔ تم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا۔ خوش ہو گئے۔ کہا ایک پان اور بناؤ۔ میں ذرا پانی پی لوں۔ پان کھا کر اور پانی پی کر تھوڑا ٹہلے پھر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے یہ ذہن اور اس کے تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے۔ بہت واضح اور نہایت بامعنی۔ وہ تمہاری عقل اور تمہارے اکتسابات شعوری و غیر شعوری سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے تصورات زیادہ مجلّہ ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پا لیتا ہے۔ نتیجے نہیں استنباط کرتا اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہاں تو...... کا خط دیکھ رہا تھا معلوم ہوتا تھا سامنے موجود ہے۔
میں نے اسے پوچھا۔ میرا گھر بنوا رہا تھا۔ محبت سے محنت سے۔ یہاں دوڑ کر جاتا ہے، وہاں سے آواز دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے رُک گئے۔ پھر بولے...... کو جانتے ہو؟ میں نے کہا پورے طور پر یاد نہیں کہنے لگے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لفافہ میں بند۔ پھر رُک کے کہنے لگے سب موجود ہیں۔ خوب بات کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ اب قبرستان میں سوتے ہیں لیکن میرے ہاں ہنستے بولتے ہیں۔ سبھوں کو بند کر رکھا ہے....."

اتنے میں ایک تانگا آیا۔ ایک صاحب نے اُتر کر کسی کا پتہ دریافت کیا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے اردگرد تصورات کی جو نیم شفاف اور نیم غیر شفاف بھول بھلیاں قائم ہوگئی تھی وہ یکایک فضا میں تحلیل ہوگئی۔ بولے بھائی آگے جاؤ یہاں کوئی نہیں۔ میں نے کہا رات زیادہ آئی۔ اب گھر جاؤں گا۔ کہا جاؤ۔

عرصہ کی بات ہے ایک دن خود بخود فرمانے لگے ہم اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ ہم جیسا خبطی شاید ہی کہیں ملے۔ لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بگڑے دل نکلے۔ صبح کمرہ میں سو رہا تھا حسب معمول رضائی اوڑھ کر اور کمرہ بند کر کے۔ ایک صاحب نشست کے کمرہ میں آئے دیکھا کوئی نہیں ہے سونے کے کمرہ پر آکر دستک دی اور سلام علیک کچھ اس انداز و لہجہ سے کیا کہ میں چونک پڑا۔ رضائی کے اندر ہی سے جواب دیا وعلیکم السلام انھوں نے فرمایا مزاج

شریف، میں نے کہا، ابھی آنکھ لگی تھی، فرمایا مولٰنا میں نے آپ کے ملاحظہ کے
لئے ایک کتاب بھیجی تھی، جواب میں عرض کیا گیا، بھیجی ہوگی، آتی ہی رہتی
ہیں، بولے آپ نے مطالعہ کیا، میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ مطالعہ کی جائے
یہ سب کچھ وہ کھڑے کھڑے فرما رہے تھے اور میں رضائی کے اندر ہی سے جواب
دے رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی، مولٰنا آپ کی دو باتوں کی شہرت سنی
تھی ایک اخلاق کی اور دوسرے علم کی۔ اخلاق کا تو حال معلوم ہوگیا، علم
کی بھی کسی دن تصدیق ہو جائے گی۔ سلام علیکم! میں گھبرا کر چارپائی سے
اٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرہ میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔

مرحوم دوست بنانے اور معالج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے
تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے سنو جی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا معالج سے فائدہ ہوتا
ہے جب تک معالج ٹکر کا نہ ہو مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک
قصہ سنایا۔ کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا کہ دلی کے کسی اصلی حکیم سے رجوع
کروں۔ چنانچہ بہت غور وفکر اور تلاش کے بعد ایک ایسے طبیب کا انتخاب
کیا گیا جو طب میں دہلی کے بعض مشہور اطبا کے استاد رہ چکے تھے ان کا نام
بھی بتایا تھا لیکن یہاں مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسی پچاسی سال کا سن
بڑے متدین، پرہیز گار اور صاحب کمال تھے۔ ان کے خیالات بھی عجیب
غریب تھے، یہ ناممکن تھا کہ ان کے مطب میں کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھ کر

جائے۔ ایک صاحب سوٹ پہن کر آگئے تھے تو ایسے بچھرے کہ سارا مطب زیر و زبر ہونے لگا اور جب تک وہ چلے نہیں گئے بیٹھے نہیں بیٹھے۔ کہتے تھے دیکھو تو جہاں میں نماز پڑھتا ہوں وہاں یہ مسخرہ ترکی ٹوپی اور کوٹ پتلون پہنکر چلا آیا۔ مرحوم نے ان سے ملاقات کی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ مرحوم نے اپنی شکایات بیان کیں۔ بھوک نہیں لگتی، قبض رہتا ہے، تبخیر کی شکایت ہے، خیالات منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے، کبھی کبھی خفقانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیند بہت کم آتی ہے وغیرہ۔

حکیم صاحب سب کچھ بہت غور سے سنتے رہے اور اکثر سر اس طور پر ہلا دیتے تھے گویا ہر بات دلنشیں ہوتی جا رہی ہے۔ جب مرحوم کہنا ختم کر چکے تو حکیم صاحب بولے ٹھیک ہے۔ بالکل بجا فرمایا، ایسا ہی ہوتا ہے ایسا ہونا چاہیئے مرحوم نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجئے تو بولے جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شرفا کا مرض ہے، شریفوں کو یہی شکایات لاحق ہوتی ہیں، مرحوم نے فرمایا آخر کوئی علاج، بولے بالکل نہیں کوئی مرض ہو تو علاج کیا جائے اشراف انھیں شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں!

میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا کالج کھلنے والا تھا، مرحوم وطن سے تشریف لا رہے تھے، میں الہ آباد میں ملا، مرحوم سکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اور مرحوم کے بڑے بھائی جو عرصہ سے اپنا دماغی توازن کھو چکے

تھے ہمراہ تھے، اسٹیشن پر مجھے دیکھا، بولے آجاؤ۔ کھانا کھایا جائے گا۔ میں نے کہا میں سکنڈ کلاس میں کیسے بیٹھوں کہنے لگے کھانا کھانے کے لیئے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا۔ تم تو آہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبہ میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور جو یہ فورٹ ولیم بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگے گھبراؤ نہیں یار ہے آجاؤ۔ میں اندر آگیا انگریز نے مولٰنا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولٰنا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولٰنا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو۔ سب ٹھیک ہے۔ سمجھے نا کھانا کھائے گا۔ اس نے اشارہ سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح راضی و خوشنود ہے۔ کھانے سے البتہ معذور رہے۔

نصف ڈبہ میں مولانا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہر طرح کے بکس بستر ٹوکریاں، ڈبے گٹھریاں، صراحی، پاندان، کھانے کا سامان کیا گیا! ایک پوری برتھ کھانوں سے بھر گئی۔ ہر طرح کے کھانے ہر ذائقہ کے حلوے، مٹھائیاں ان کے علاوہ۔ کہنے لگے یہ کھاؤ ہماری طرف کی خاص چیز ہے نیب کی کونپل اور کلیاں قیمہ کے ساتھ پکائی گئی تھیں۔ بڑی تیز مرچیں ڈالی گئی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچ کا تھا، پراٹھے، خستہ ٹکیاں اور پوریاں علٰحدہ تھیں۔ بڑے مزے سے کھانا کھایا گیا۔ کہنے لگے خوب کھاؤ والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے،

بھیجے ہو ماں نے پکایا ہے۔ ہاں۔ وہ یہ خیال کر کے ایسی خوش ہوتی ہوئی
کہ سلیمان کھا رہا ہے، کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفر حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانے میں
شریک ہوتے۔ کیسی ہی پر تکلف دعوت یا معزز مہمان کیوں نہ ہوتے۔ یہ
ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ مرحوم ان کو "بھائی جان" کہتے تھے۔ بھائی جان
بولتے بالکل نہ تھے، دسترخوان پر یک بیک آجاتے اور جو کچھ جی میں
آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور فوراً اٹھ کر چل دیتے، بھائی جان
کی طرف دیکھ کر کہتے کیوں بھائی جان ٹھیک ہے نا۔ وہ حسب معمول بالکل
جواب نہ دیتے۔ ماں کا نام اور غالباً مرحوم کی جوش اور محبت بھری
باتیں سن کر پہلو بدل لیتے اور جلدی جلدی ہر چیز میں ہاتھ ڈالتے کچھ
ٹٹولتے اور تھوڑا بہت اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔

اسی زمانہ میں میری والدہ مرحومہ نے رحلت فرمائی تھی مرحوم نے
ماں کی باتیں کچھ ایسی وارفتگی سے بیان کرنا شروع کی تھیں کہ میری
طبیعت بھر آئی مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کیے
ہوئے، یا کھانے کی طرف سے توجہ ہٹائے ہوئے کہا، ہاں ہاں وہ تو بھی
معلوم ہی لیکن ہو نہ چکا، خیال فرماتے ہو بس ہو چکا، بڑی خوش نصیب تھیں
کہ تمہارے سامنے مریں تم ان کے سامنے نہ مرے ان کو یاد رکھو، ہمیشہ یاد

رکھو۔ ماں کو کون بھولتا ہے۔ جب تک نہ بھولو گے لڑکپن کی خوشدلی اور حوصلہ باقی رہے گا۔ یہ لو پانی پیو۔ سب کچھ ماں کا دیا ہوا ہے اور یہاں یہ لینا۔ یہ آم .... کے باپ نے دیا تھا۔ کہتا ہے اس کے باغ کے درخت کا پہلا پھل ہے، جب تک میں نہ چکھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں تمہارا بھی حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارے بہار کا آم ہے۔

اتنے میں فتحپور آ گیا، کہنے لگے جاؤ، اٹاوہ پر پھر ملنا چاہئے پی جائیگی۔

مرحوم ہمیشہ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بڑے سامان و اہتمام کے ساتھ۔ سیٹ ہمیشہ ریزرو کرا لیتے تھے۔ مرحوم اس زمانہ سے سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے جب سکنڈ کلاس میں سفر کرنا خاص منزلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان و اہتمام کے ساتھ آج کل میں اچھے اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سلون میں سفر کرتے نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی صاحب وقار سفر کر رہا ہے۔ آسائش کی ہر چیز بڑھیا اور ستھری ہمسفروں کا رکھ رکھاؤ۔ لباس و اطوار میں صفائی اور خوش سلیقگی جس غرض سے سفر کرتے تھے صرف اسی کو پورا کر کے واپس آ جاتے تھے ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ جس خاص غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور کر کے واپس آئے ہوں۔

مشکل سے سال بھر ہوئے ہوں گے۔ رات کا وقت تھا، باہر چبوترہ

پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے آج تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ تو بتاؤ دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی گزرتا ہے میں نے کہا میں آپ کے سوال کی نوعیت نہ سمجھا۔ خطرہ سے کیا مراد ہے۔ کہنے لگے مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے یہ اچھا کام نہ ہو سکا حالانکہ ہم ایسا کر سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے، کہنے لگے، ہاں ہاں وہی بات تو پوچھتا ہوں۔

میں نے کہا آج علی گڑھ آئے ہوئے ۲۳۔۲۴ سال ہوئے گھر سے پہلے پہل نکلا تھا تو زندگی کچھ اور تھی۔ اب کچھ اور ہے پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا۔ اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہے۔ یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ ماں باپ بھائی بہن جو آج سے ۲۳، ۲۴ سال پہلے موجود تھے سوا والدہ مرحومہ کے بقیہ سب بقید حیات ہیں اور میری کامرانی سے خوش اور مطمئن۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی یہاں کی ہماہمی، بیوی بچے، دوست احباب، وطن سے دوری اور اس قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا موقع ہی نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور عزت میں شریک ہونے کا حق رکھتے

تھے، مجھ پر بہنوں کے حقوق ہیں ان حقوق کو میں تھوڑا بہت ادا کرنے کی
کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہئے اس سے
اغماض کرتا ہوں۔ بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں، بھائی بھی برسرکار ہیں
ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی ترشی سے۔ والد صاحب
گھر پر ہیں۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں تو سب کو دیکھ بھال آتا ہوں۔ والد
صاحب آرام سے ہیں اور باوجود اس پیرانہ سالی کے وہ اب بھی دوسروں
سے خدمت لینے کے بجائے دوسروں ہی کو آرام پہنچاتے ہیں۔ میں جاتا
ہوں تو پھولے نہیں سماتے اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لئے اور
اپنا بھی، وہی باتیں کرتے ہیں جو بچپن میں میرے لئے روا رکھتے تھے۔ میں
تھوڑے ہی عرصہ کے لئے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد ہی واپس آجاتا
ہوں، مجھے معلوم ہے اگر میں اُن سے ملنے کے لئے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو
ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ میں بیوی بچوں
میں جلد سے جلد واپس آجانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں اس لئے اشارۃً کنایۃً
بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں تھوڑے عرصہ کے لئے اور ٹھہر جاؤں۔

میں تھوڑی دیر کے لئے رک گیا اور بولا، مولانا آپ کے سوال نے دل
کے مدتوں کے اٹے ہوئے سوتے کھول دیئے۔ ایسا تو نہیں کہ آپ اکتانے لگے
ہوں، علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ آپ نے

نہیں معلوم دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی کہ اس وقت طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اس گفتگو کو یہیں کیوں نہ ختم کردوں۔ مرحوم پر اس وقت ایک استغراقی کیفیت طاری تھی۔ چونک پڑے، کہا نہیں نہیں کہے چلو۔ اب ختم کیئے بغیر نہ رُکنا۔

میں نے کہنا شروع کیا، سارا قصہ میں اس اندیشہ سے نہیں دُہرانا چاہتا کہ خود ناظرین کو اُن سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک وہ باتیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اُس عمل ذہنی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو میں یہاں بتانا چاہتا تھا۔ میری داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ کی زندگی اُس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی تھی جو میں اپنے والدین اور اعزا کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا تھا۔ اس زندگی میں جہاں میں گزشتہ آلام و مصائب کو بھول چکا تھا وہاں اُن ذمہ داریوں کو بھی بڑے حد تک نظر انداز کر گیا جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں اتنا ان کے رنج و راحت سے ملول یا محزون نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

میں بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا

ہوں میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرت کے پیالہ کو جو بہت ہی اتھلا ہے اپنی توجہ سے لبریز کر دوں لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نفس حیلے تراشتا ہے تو میں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔

مرحوم گردن جھکائے ساری داستان سنا کئے، میں خاموش ہو گیا تو یک لخت چونک سے پڑے، فرمایا، بڑی بات کہہ ڈالی اللہ بخشنے والا ہے خوب کہی، ٹھیک کہی، میرے دل کی بات کہہ دی۔ اللہ خوش رکھے، پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے، کمر پر ہاتھ باندھ کر سر نیچا کئے دیر تک ٹہلا کئے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہہ دیتے، ٹھیک کہی، بڑے پتے کی بات کہی، بڑی مبارک بات ہے۔ نئی بات کہی، مرحوم کی اس وقت عجیب حالت تھی، کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے عالم جذب طاری ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے بہت مسرور و مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم رہی۔ آخر میں کہا اس وقت جاؤ پھر کبھی اس پر مفصل بحث ہو گی۔

مرحوم کالج کے ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت پکّی کچّی بارگوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے اور آمد و رفت کے لئے صرف وکٹوریا گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا جس پر دربان مقرر تھا اور آنے جانے والوں کے نام و پتے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر بھائی منزل (دو منزلہ) کے دروازے جس میں مرحوم تمام عمر مقیم رہے مارئیسن روڈ

پر کھلتے تھے۔ مرحوم بڑی رات گئے تک بیدار رہتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے سے سید محمود کورٹ میں آجا سکے۔ مسجد سے عشا کی نماز پڑھ کر واپس آتے اور کچھ لوگ ساتھ ہوتے تو مرحوم ان کو کبھی اپنی طرف سے باہر نکلنے نہ دیتے۔ ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ وکٹوریا گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلبا یا غیر طلبا کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس پر طلبا یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوئی لیکن مرحوم نے اپنے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

کم و بیش تیس سال تک دو منزلہ میں مقیم رہے۔ اگر مرحوم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو دو منزلہ میں مرحوم کا موجود ہونا بھی یقینی تھا۔ برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ناممکن تھا کہ مرحوم محض تفریحاً یا اخلاقاً کہیں اور ملنے ملانے چلے گئے ہوں۔ ہمیشہ اپنے مستقر پر ملے۔ سوا اس کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو۔ بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ مرحوم نے سوئمنگ باتھ نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ یہ بات میں نے بہت کم لوگوں میں پائی۔

یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن جلسے ہوا کرتے تھے۔ مرحوم ان میں کبھی نہیں شریک ہوئے۔ اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پڑیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا پیچ۔ ایسے لوگوں کے لئے ساری دنیا پڑی ہے وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم و فضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی صاحب فضل و کمال آئے تو البتہ!

ایک بار کوئی میٹنگ تھی جس میں گفتگو تیز ہونی شروع ہوئی، ایسے موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے تھے مولانا کو دبایا کہ خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے۔ مرحوم نے جھک کر کہا۔ خاموش کیسے ہو جاؤں وائسرائے کو ایڈرس نہیں دیا جا رہا ہے علم و ایمان کے مسائل ہیں۔ خیال فرماتے ہونا۔ علم و ایمان کی آزمائش ہے نیازمندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے۔ میٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کیوں جی یہ تم بھیگی بلی بنے کیسے بیٹھے رہے میں نے کہا مولانا بس تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی ورنہ آپ دیکھتے کہ بھیگی بلی گربہ عاجز بن جاتی۔ بڑے زور سے ہنسے پھر فرمایا "لیکن رہتے بلی ہی"۔

مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے

بھی بقول ان کے کھاتا کھلا ہوا تھا۔ خانقاہ سلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابوبکر صاحب، محمد مقتدیٰ خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاء الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولانا ابوبکر صاحب کے بڑے مداح تھے ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔ تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے، میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا۔ مولانا ابوبکر صاحب کو منہ کی تکلیف ہوئی اور علالت کسی قدر تشویش ناک صورت اختیار کرنے لگی تو ایک دن بڑی بے قراری سے فرمایا، اللہ شفا دے یونیورسٹی کیا دور دور ایسا آدمی نہ ملے گا۔ علوم پر بڑی اچھی نظر ہے۔ بڑی گہری نظر ہے، حاضر علم ہے بڑی متوازن شخصیت ہے۔ نہ رعب کھاتا ہے نہ رعب ڈالتا ہے، یہ بات مولویوں میں نایاب ہے۔ پھر یاروں کا یار ہے۔ کہتے کہتے ایسا معلوم ہوا جیسے طبیعت میں گدگدی پیدا ہو گئی۔ کہنے لگے عجیب آدمی ہیں۔ کوئی کام ہو کسی کا کام ہو کسی سے ہو عبا پہنی رومال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا سنبھال کر گھر سے نکل پڑے۔ یہ شخص فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے ادا کرنے میں لطف اٹھاتا ہے۔ آج کل دیکھو کس کرب میں مبتلا ہیں لیکن

نہ معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں کوئی تردد یا اضمحلال کتنوں کی ان کے دم سے پرورش ہے۔ ہاتھ کھلا، دل غنی۔ بڑا سیر دار آدمی ہے نا!

ذاکر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا چلئے مولانا سے مل آئیں۔ ہم جیسے پہنچے مرحوم استنجا کرنے جا رہے تھے میں پہلے کمرہ میں داخل ہوا کہنے لگے "اخوہ یہ سواری باد بہاری کہاں سے آئی" اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کر آؤں۔ فوراً ہی ذاکر صاحب کمرہ میں داخل ہونے دیکھتے ہی مسرت سے چہرہ جگمگا اٹھا۔ ایک خاص انداز ترنم سے بولے اہو ہو ہو "ڈاکٹر تم کہاں" اہلاً و سہلاً۔ ذاکر صاحب نے فرمایا عرصہ سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کر لیا کہ ضرور جاؤں گا، بولے جزاک اللہ، جزاک اللہ۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولے خدا خوش رکھے انھیں خوب لائے خوب لائے۔ لوٹا زمین پر رکھ دیا۔ میں نے کہا استنجے سے فارغ ہو آئیے۔ کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہو گی۔ اب سب کام ملتوی۔ یہ کہہ کر تخت پر جا کر دوزانو بیٹھ گئے۔ تخت پر مولانا کم بیٹھتے تھے۔ کوئی ہوتا یا آتا مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میز کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے بیٹھے رہتے یا بیٹھتے۔ تخت پر دوزانو بیٹھنا خاص ہی خاص مواقع پر ہوتا۔ جب طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی تو تخت پر آجاتے اور دوزانو بیٹھتے۔ یہ

انھیں کا فقرہ ہے کہ اب اجلاس تخت پر ہوگا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ لطف صحبت میں کسی قسم کا خلل آنے نہ دیا جائے گا اور صحبت پورے طور پر گرم ہوگی۔ چائے تیار کی گئی۔ شفاف سنہری مائل چائے عنبر کی خوشبو سے معطر، تھوڑی شکر ملی ہوئی بغیر دودھ کے خوشنما بلوریں فنجان میں۔ اس درمیان میں کوئی دوسرے درجہ کا آدمی آجاتا تو اُسے فوراً رخصت کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے اس وقت جاؤ پھر کبھی آنا۔

اُس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی بڑے لطف کی باتیں بڑے محبت کی باتیں اور بڑے پتے کی باتیں۔

میں نے بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی پُر لطف باتیں کرتے سنا ہے۔ برمحل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیفے خواہ وہ کیسے ہی ہوں بے ضغطہ زبان کہتے تھے۔ ان کی زبان پر بعض غیر ثقہ فقرے بھی بڑے مزہ کے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ان کا بڑے عرصہ تک ساتھ رہا ہے۔ میں نے ان کو شاید ہی کبھی ایک ہی لطیفہ یا فقرہ دُہراتے سُنا۔ میں ایسوں سے بھی واقف ہوں جو بڑے لسان اور طرّار سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار صحبتوں کے بعد اکثر یہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع بے موقع دُہرا دیئے جاتے ہیں۔ برمحل اور اچھوتا فقرہ چُست کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ مرحوم کو اس میں خاص درک تھا۔

میں نے انھیں جلال کے عالم میں بھی پایا ہے۔ علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آجاتے۔ لیکن اس جلالت کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا مذہب کے بل پر یا اُن کے ناموس کی حفاظت میں آمادہ جہاد ہیں۔ تکبر یا نخوت کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ لیکن جب بے تکلّف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی، رنگینی، وزیبائی ہوتی، مرحوم یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں

"عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوزِ دروں"

کا نقشہ بھی پھر جاتا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دو سال پہلے علی گڑھ میں ہوا۔ بڑے بھائی جنھیں مرحوم "بھائی جان" یا بھیا کہتے تھے مدتوں سے جنون میں تھے، بولنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ چپ چاپ ادھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے لئے تکلیف دہ تھے۔ مولانا مرحوم، بڑے بھائی سے اس حال میں جتنی محبت کرتے تھے اور اُن کے راحت کی جزئیات پر جیسی ان کی نظر تھی اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ سکنڈ کلاس میں انھیں ساتھ رکھتے تھے۔ دسترخوان پر معزز سے معزز مہمان کیوں نہ ہوتا بڑے بھائی ضرور بلائے جاتے۔ بڑے بھائی جس طرح جس کھانے کو کھانا چاہتے

کھاتے۔ ان کے لئے سردی گرمی کا لباس بڑی محبت اور تکلف سے بنواتے۔
"بھائی جان" ہی کے لئے آدھ چی پیر بھائی منزل کی شمالی سمت ایک
احاطہ بنوادیا تھا جس میں ہر طرح کے پھول کے درخت لگوادئے تھے برآمدہ
میں پھولوں کے گملے تھے۔

بھائی بیمار ہوئے تو مرحوم سے پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض
اپنا حال نہیں بتا سکتا تھا' معدہ کی تکلیف تھی حکیم[1] صاحب معالج تھے۔
ان کی مشکل یہ تھی کہ معدہ کو آلایشوں سے پاک کرنے کا جو طریقہ مناسب
ہوسکتا تھا مثلاً عمل دینا اسے مولانا مرحوم برتنے نہیں دیتے تھے۔ کہتے
تھے بھیا نے جو بات تمام عمر گوارا نہ کی اسے آخر وقت میں کیسے ہونے دوں
معلوم نہیں وہ کس عالم میں ہوں۔ ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ بول
براز کا امتحان یا ان کے اخراج کا طریقہ یا ان کے متعلقات پر گفتگو کرنا
خود مولانا مرحوم بالکل نہیں پسند کرتے تھے۔

بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے
سونے بیٹھنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ لباس میلا' خط بڑھا' اوقات مقررہ میں
گڑبڑ' گفتگو میں ناہمواری کہتے تھے نفس نے اپنے مطالبات چھوڑ دیئے
ہیں۔ حکیم صاحب نے نہایت محبت ہوشیاری اور جانفشانی سے علاج

---

[1] حکیم محمد عبداللطیف صاحب لکھنوی وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ۔

لیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، دوائیں آش جو شربت اور دیگر ضروری چیزیں گھر سے تیار کرا کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پاکر بعض کے پاس آجاتے ہر طرح کے جتن کئے گئے لیکن ایک پیش نہ گئی اور بھائی جان مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ایک دن مرحوم خود بخود فرمانے لگے رشید امعلوم ہوتا ہو کہ میری خمیر بھی علی گڑھ ہی کا ہے۔ پہلے اکثر خیال آیا کہ اچھے برے دن سبھی دیکھ لئے اب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں اور وطن جاکر بزرگوں کی یاد میں بقیہ زندگی بسر کر دوں۔ علی گڑھ میں زمین بھی مل سکتی تھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ یہیں مکان بنوالوں اور رہ بسوں، بھیا زندہ تھے تو یہ سب خیال آتے تھے وہ چل دئے۔ بہت سی ذمہ داریاں ختم ہوئیں تو بعض کمزوریاں بڑھ گئیں۔ اب ٹھان لی ہے کہ بھیا ہی کے قدموں میں جا بسوں۔ خدا سید زین الدین کا بھلا کرے انھوں نے اپنے قبرستان میں تھوڑی سی جگہ دے دی ہے۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں ذمہ داری ختم ہو جائے تو کمزوری سے مغلوب ہو جانا کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

مرحوم کی زندگی کچھ عرصہ سے خراب چلی آتی تھی بڑے بھائی کی وفات کے بعد اس میں بین اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے رمضان میں بخار آیا، معالج کے اصرار کے باوجود روزے رکھنے سے باز نہ آئے لیکن جب طبیعت

زیادہ نڈھال ہونے لگی تو روزے ترک کر دیئے۔ مرض نے طوالت پکڑی لیکن کچھ عرصہ بعد افاقہ کی صورت پیدا ہوئی۔ میں بہت دنوں سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی پر وہاں گیا تو سونے کے کمرہ میں ملے۔ دروازہ کے پاس ہی ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کمزوری ضرور تھی لیکن چہرہ روشن تھا گفتگو آہستہ آہستہ کرتے تھے لیکن آواز میں خستگی نہ تھی۔ دیر تک بات کرتے رہے جس میں ہراس یا مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا کہنے لگے رشید جو کچھ ہوا ہوا جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا لیکن یہ تمہارا حکیم بڑا بے نظیر آدمی ہے۔ خدا اُسے خوش رکھے کیا کوئی عزیز کرے گا جو اس نے کیا۔ ایسے لوگ اب کہاں۔ بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ صاحب فن کی حیثیت سے میں نے اُسے گھبراتے نہیں دیکھا۔ محبت کی وجہ سے البتہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ نوجوان ہے نا۔ عمر گزرنے پر یہ بات جاتی رہے گی۔

مرحوم کی وفات کے بعد ایک دن حکیم صاحب سے گفتگو آئی تو وہ بھی تعجب کرتے تھے کہ ایسے پکے عقیدہ کا مریض انھوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے مرحوم کے مزاج کی عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔ اُن کا علاج اُس وقت تک کوئی کر ہی نہ سکتا تھا جب تک کہ ان کے اعضائے رئیسہ کی عجیب و غریب و بسا اوقات متضاد و جلد جلد بدلنے والی کیفیات سے پورے طور پر آشنا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ ادویات تجویز کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا

کہ کون سی دوا کس حد تک مفید ہوگی اور کہاں پہنچ کر وہ مرحوم کے مزاج سے بے آہنگ ہو جائے گی۔ جب مرض کی شدت غالب آنے لگتی ہے تو اکثر طبیب کو بھی استبدادی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضابطہ دوا اور طریق علاج سے ہٹ کر بعض کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ دواؤں سے اعضاء پر کوئی ردعمل نہ ہوتا تھا اور تھوڑا بہت ہوتا بھی تھا تو نقصان کی طرف ہوتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے یہ محسوس کرکے کہ ممکن ہے مرحوم میرا لحاظ کرکے کچھ نہ کہتے ہوں ایک دن میں نے دبی زبان سے یہ کہا کہ مولنا اب معالج بدل کر دیکھا جائے کیا ہوتا ہے ممکن ہے مرض میری سمجھ میں نہ آتا ہو یا میری تدابیر کارگر نہ ہوتی ہوں۔ حکیم صاحب کہتے تھے مولنا پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی، کہنے لگے حکیم یہ سمجھتے ہو کہ مولوی مرگیا تو لوگ کہیں گے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مرا۔ خبردار خبردار مت گھبرانا علاج تمہارا ہی رہیگا۔ مارنا جلانا تمہارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ علاج کئے جاؤ۔ بہت ٹھیک علاج کر رہے ہو۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج قیامت تک نہیں بدلا جائیگا سمجھے نا؟ ہاں!

ہر شخص نے حتیٰ کہ مولانا مرحوم کے ایسے دوستوں نے جن کو وہ نہا

محترم و عزیز رکھتے تھے اصرار کیا کہ علاج بدل دیا جائے۔ مرحوم نہ مانے اور
ہمیشہ یہ کہتے رہے تم لوگ میرے حکیم کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑے معرکہ کا علاج کر رہا
ہے۔ میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ مولانا نے
ایک بار فرمایا تھا کہ حکیم اب کے تو جانبر ہو گیا۔ اب بخار آیا تو پھر نہ اترے گا۔
اور ایسا ہی ہوا۔

پچھلی عید میں مرحوم نے مسجد میں نماز پڑھی۔ کمزور ہو چکے تھے۔ میرا اور
بعض دوستوں کا مدت سے یہ معمول چلا آتا تھا کہ مسجد سے واپسی پر سب سے
پہلے دو منزلہ آتے اور مرحوم سے مل کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے
گزشتہ عید کے موقع پر پہنچا تو مرحوم ملاقات کے کمرہ میں احباب و عقیدتمندوں
کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ اسی وقت مسجد سے واپس آئے تھے۔ تھکن سی محسوس
کر رہے تھے فرمایا بھائی معانقہ سے معاف کرو دم لینے کرسی پر بیٹھ گئے اور
مصافحہ کرنے لگے۔ میں پہنچا تو اٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا
اور اپنے لمبے چوڑے سرخ کھٹے دار رومال سے پیشانی سے بار بار پسینہ
پونچھتے تھے لیکن چہرہ پر بشاشت تھی اور آواز میں کرارا پن' مرحوم آواز
کے لئے اکثر یہ لفظ (کرارا پن) استعمال کرتے تھے۔

ماہ صیام آ رہا ہے۔ عید بھی آئے گی۔ اس وقت جبکہ یہ سطریں لکھ
رہا ہوں رمضان کے کتنے مہینے اور عید کی کتنی تقریبیں یاد آ رہی ہیں تراویح

کے بعد مرحوم کے ہاں کی وہ صحبتیں جب چائے کا دور ہوتا تھا مخلصین کا مجمع لطف کی باتیں۔ مرحوم کی باتوں میں وقت کتنا جلد جلد گزرتا تھا۔ جو کوئی آتا اس پر محبت کا کوئی فقرہ چست کرتے۔ چائے کی پیالی پیش کی جاتی کسی کے حلیہ پر کوئی فقرہ کہہ دیتے۔ کسی کے لباس کی تعریف کر دیتے کسی کی کارگزاری کی داد دیتے۔ کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر کسی کی رائے لیتے اور مذاق ہی مذاق میں اس کے بعض نازک پہلو اس طور پر بیان کر جاتے گویا وہ بات بھی اس صحبت کی تفریحی گفتگو کا ایک جز تھی۔ عید کی نماز سے واپسی پر "حلقہ احباب" گرم ہوتا۔ چائے عطر و پان سے ہر ایک کی تواضع کی جاتی۔ ہر شخص کے مذاق کو مدنظر رکھ کر اس سے پرسش احوال کرتے۔ کالج پالٹیکس پر کبھی مجمع میں اظہار خیال نہ کرتے اور نہ کسی کو اس قسم کے مسائل چھیڑنے کی ہمت ہوتی۔

دوسری بار مرحوم علیل ہوئے تو روز بروز حالت گرتی ہی گئی۔ اس دوران میں عرصہ تک میں حاضر نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض قابو میں نہیں آرہا ہے۔ اس حالت میں مرحوم کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ جس شخص کو تندرستی، زندہ دلی استقلال و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا اسے بے بس و ناتوان دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف

اور پرو وائس چانسلر صاحب کے خط کا منتظر تھا کہ نوکر نے آکر خبر دی کہ مولانا صاحب کی طبیعت خراب ہے حکیم صاحب اور دوسرے لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ انا للہ نکلا۔ گرتا پڑتا دو منزلہ پہنچا۔ ہجوم دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ کمرہ میں سب لوگ جمع تھے۔ کئی ڈاکٹر بھی بلائے گئے تھے۔ مشورہ ہو رہا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ غفلت طاری رہنے لگی ہے۔ کبھی کبھی ہوش میں آجاتے ہیں۔ علاج بدلنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جو کچھ ہونے والا ہے اُسے اب کوئی ٹال نہیں سکتا۔ علاج بدلنا نہ بدلنا دونوں برابر ہیں۔ دل البتہ نہیں مانتا۔ شاید ڈاکٹری علاج سے نقشہ بدل جائے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر جو مرحوم کے سب سے مقرب و محترم تھے اندر تشریف لے گئے میری اب بھی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا۔ مرحوم کی حالت غیر ہو چکی تھی لیکن پہلے حکیم صاحب سے پوچھا حکیم تم بھی چاہتے ہو کہ علاج بدل دیا جائے۔ حکیم صاحب نے کہا ہاں۔ فرمایا تو پھر جو چاہو کرو۔

یہ ہو چکا تو دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا۔ کسی نے میرا نام لے کر باآواز بلند کہا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ مرحوم نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ مرحوم نے مجھے دیکھ کر پہچانا ہو۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے پھر یاد دلایا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ نہایت خفیف آواز میں فرمایا

"اب آئے ہو...... بڑی دیر کردی" اس کے بعد آنکھیں بند کرلیں۔ ذری ہی دیر میں پھر ہوشیار ہوئے فرمایا یہ "کیا ہو رہا ہے" یہی تین فقرے تھے جو میں نے سُنے۔

کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرحوم کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہا۔ موت کا تصوّر کبھی کبھی ماضی کے دھندلے نقوش کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتا ہی۔ اتنا نمایاں گویا ان میں از سرِ نو زندگی ڈال دی گئی ہے۔ مجھے پچھلا زمانہ ایک ایک کرکے یاد آنے لگا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اٹھارہ سال قبل میں رہ چکا تھا۔ مرحوم نے ایک دن اس زمانہ میں مجھ سے فرمایا کہ اس عمارت کے دو حصّوں میں ہم و تم آباد ہیں میرے لیے موجودہ حصّہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ بھائی جان کو بھی تکلیف ہے۔ اگر یہ حصہ بھی مل جاتا تو ہم لوگوں کے لئے بڑی آسانی ہو جاتی۔ میں اسٹاف میں آگیا تھا اس لئے بڑی آسانی سے مجھے اور کمرے مل گئے اور میں وہاں اسے رخصت ہو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آرہا تھا۔ اس کمرہ میں معلوم نہیں کیسے اور کیوں وہ باتیں یاد آنے لگیں جن سے زندگی کے بعض بڑے دلکش نشیب و فراز وابستہ تھے۔ اپنے ہی نہیں مرحوم کے بھی۔ اُن کے دُہرانے سے کیا حاصل۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں مرحوم بڑے شوق سے آئے تھے۔ اس میں ان کے شوق کی تمام چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہیں وہ بے تکلف

اور مخلص احباب سے بڑے شوق سے ملتے تھے۔ اور ــــــ یہیں سے وہ آج ہر شوق سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو دوسروں کے لئے سہارا تھا آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی خلوص اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں۔ جس سرچشمہ سے میں اور کتنے اور تقویت اور بشاشت حاصل کیا کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ کے لئے خشک!

میں بیٹھا رہا۔ مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی۔ جی چاہتا کاش مولانا یک لخت تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کہتے "خوب آئے بیٹھو گپ ہو گی۔ کدو اب بڑا ہو گیا۔ ناچے گا نہیں۔ پان کھاؤ۔ ایک مجھے بھی دینا" میری وہ حالت تھی جب آدمی دعا نہیں مانگتا۔ شاید مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا عبث ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے۔ ناممکن ممکن ہو جائے۔ یہ خواہش دعا مانگنے سے بھی زیادہ عبث ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ بات جتنی ناممکن ہے اتنی ہی فطری بھی معلوم ہوتی ہے!

میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ ڈیڑھ دن بعد مولانا سلیمان اشرف صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اور اللہ نے اپنے بہادر کو ہم میں سے اٹھا لیا!

جنازہ کے ہجوم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل
میدان میں نماز کے لئے جنازہ رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے
لگا جو دفن میں شریک ہونے کے لئے دوڑتے بھاگتے چلے آرہے تھے۔
نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق نواب صدر یار جنگ بہادر کو پہنچتا تھا
اچانک علالت کے سبب سے موصوف تشریف نہ لا سکے۔ مولنا ابوبکر صاحب
منہ کے زخم رسنے کے سبب سے معذور تھے چنانچہ مولنا شفیع صاحب نے
نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت جبکہ نماز جنازہ کا مسئلہ زیر غور تھا مجھے مرحوم
کی ایک بات یاد آئی۔ عرصہ ہوا مولنا نے مجھ سے ایک بار فرمایا تھا۔
دیکھو دینیات کے پرچہ میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ دیتا ہوں
اس کا سبب جانتے ہو۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے
مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے وہ نماز جنازہ ہے۔ میں مرنے
لگوں گا تو مجھے یہ تو اطمینان رہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نماز
جنازہ پڑھائے گا!

اس وقت جبکہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا کہ نماز جنازہ کون پڑھائے مجھے
مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد
نماز پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جب
جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہئے تھی۔ وہیں تعزیت کا رزولیشن پڑھ کر گھر واپس
آگیا اور نماز جنازہ کا بدل تعزیت کا رزولیشن رہ گیا!